پروفیسر تاثیر وجدان (ملتان)

تحریک حُریّت کی روحِ حارہ

۲۳ اکتوبر ۱۹۹۵ء کو سیال ہسپتال میں رات کے دس بجکر چالیس منٹ پر سید ابو معاویہ ابوذر (عطاء المنعم) بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی تقریباً ستر سالہ زندگی (۱۹۲۶ء تا ۱۹۹۵ء) اپنی قسمت ازلی میں لکھی آخری سانس پوری کر چکی تھی۔ سفینہ بحر بیکراں کے متلاطم پانیوں کو اپنے پیچھے چھوڑتا ہوا ایک المناک سناٹے کے ساتھ افق کے اس پار اتر گیا تھا۔ کہانی اپنے منطقی انجام کو پہنچ گئی تھی۔۔۔۔۔۔ مسافرِ آخرت کی آخری زیارت کے لئے موجود ہر آنکھ فرطِ غم واندوہ سے اشکبار تھی اور زبان خاموشی میں جانے والے سے پوچھ رہی تھی۔

اے تماشا گاہ عالم روئے تو

تو کجا بہر تماشامی روی؟

(ترجمہ) ایک دنیا ہے جو آج تیرے روئے زیبا پر نظریں جمائے کھڑی ہے۔ لیکن وہ کون ہے جس کے دیدار کے لئے تو ساری دنیا کو چھوڑ کر آگے بڑھ گیا ہے۔ رب کریم کا لاکھ بار شکر کہ موجودات کے چار سو پھیلے ہوئے صنم کدہ کثرت میں ہم صرف ایک کے پجاری ہیں اور ایک ہی کی طرف انجام کار مراجعت کرنے والے بھی (والیہ راجعون) ہماری فنا پذیر ارضی زندگیاں مالک الملک کی ملکیت ہیں۔ مالک کو اپنی ملکیت پر تصرف کا بھی پورا پورا حق ہے۔ وہ جب چاہے یہ امانت ہم سے واپس لے لے ہمارا تسلیم و رضا کا یہی رویہ درست ہے اور یہی فطرتاً ہونا بھی چاہیئے لیکن مرحوم کے سانحہ مفارقت نے دل و دماغ کو جس شدید احساس زیاں سے دوچار کر رکھا ہے۔ اس کے نتیجے میں ایک ہی تلخ اور حوصلہ شکن سوال بار بار ابھر کر سامنے آتا ہے کہ قحط الرجال کے اس دور سیاہ نصیب میں جب نوحہ بلب پریشاں حال زندگی قدیم یونانی حکیم کے روپ میں بقول رومیؒ "انسانم آرزو ست" کی ماتمی صدا لگا رہی ہے اور لگائے ہی چلی جا رہی ہے کہ اس کے چاروں طرف افق تک عام طور پر صرف حیوان ہیں سچے انسان کہیں نہیں اب مرحوم کی جگہ کون لے گا؟ اس کا ثانی کہاں سے آئیگا؟ اقبال علیہ الرحمۃ کا فارسی کا ایک شعر ہم پر واضح کرتا ہے کہ دنیا میں کامل ہستیاں روز روز پیدا نہیں ہوتیں۔ ان کی ولادت کو صدیاں لگ جاتی ہیں۔ شعر کا ترجمہ مع ترجمانی یوں ہے۔ زندگی دیرو حرم کی عبادت گاہوں میں کسی انسان کامل کے ظہور کے لئے عمروں تک نالہ وفغاں کرتی ہوئی اپنے خالق کے حضور دست بہ دعاء رہتی ہے، تب کہیں محفل عشق وجنوں سے (یعنی برگزیدہ و برتر زندگی کی مجلس سے) کوئی ایک ایسا انسان صورت پذیر ہو کر باہر آتا ہے جو صحیح معنوں میں عارف راز یا محرم سرّ وجود ہوتا ہے۔ میرے ممدوح سید ابوذر بخاری مرحوم اس سطح اور صنف کے انسان کامل نہ سہی پھر بھی ان کی غیر معمولی منفرد صلاحیتوں کو اور خصوصاً دور حاضر میں عظیم انسانوں کے قحط کے المیئے کو پیش نظر رکھتے ہوئے۔ انہیں عصر رواں کے اہم تاریخی اکابر میں ضرور شمار کیا جاسکتا ہے۔

ہمہ گیر دینی اور قومی انحطاط کے موجودہ دور میں جب عام آدمی تو درکنار بعض نام نہاد داعیان اسلام تک اسلام دشمن قوتوں کے ساتھ ہر قدم پر بزدلانہ مفاہمتوں اور ناروا صلح کوشیوں کا رویہ اپنا چکے ہوں اور خصوصاً مقتدر سیاسی طاقتوں کے ساتھ دُنیوی مفاد اور مطلب براری کے لئے اپنے ضمیر کا سودا کرنے میں بھی کسی قسم کی ہچکچاہٹ اور رکاوٹ محسوس نہ کر رہے ہوں اور وہ اس شعر کی زندہ اور جیتی جاگتی تصویر بن گئے ہوں کہ

دل و جاں کردہ ام نذرِ بتاں اکنوں ہمی خواہم
اگر یابم خریدارے فروشم دین و ایماں را

(ترجمہ) میں اپنے دل وجان تو بتوں کی نذر کر چکا ہوں اور اب یہ خواہش ہے کہ کوئی نفع بخش خریدار مل جائے تو اپنے دین وایمان کو بھی فروخت کردوں۔

اس قسم کے سیاہ اخلاقی زوال کے موجودہ دور میں جب اہل حق اپنے مقام سے گر کر تنزّل کے اس نقطے اور احساس کمتری کی اس حد تک پہنچ گئے ہوں کہ مارے شرم کے مغربی جمہوریت کے سامنے مغربی اور مشرقی کی حدود قیود سے آزاد، ہمہ جہتی، ہمہ گیر اسلام کو چھپاتے پھر رہے ہوں اور ان میں گواہیٔ حق کا یارا تک نہ ہو یا اگر وہ چاروناچار حق کی گواہی دے بھی رہے ہوں تو اپنے حق کے ساتھ ازراہ مصلحت جھوٹ کی ملاوٹ کو بھی ضروری خیال کرتے ہوں تاکہ ان کا رواداراور صلح پسند حق اپنے دھیمے پن کی وجہ سے مقتدر باطل قوتوں کے مزاجِ قیصری کو گوارا ہو سکے اور ان کی جبینِ خسروی پر بیزاری کی شکن نہ پڑے اس وضع کی افسوسناک ضمیر فروش مفاہمتوں کے انحطاطی موسموں میں کون سید ابوذر مرحوم کی طرح کونوا قوامین لله شهداء بالقسط اور اس کے ساتھ ساتھ ولا تلبسو الحق باالباطل وتكتموالحق وانتم تعلمون کی عظیم آسمانی پکار پر لبیک کہتے ہوئے محض اللہ کی خاطر اٹھ کھڑا ہوگا اور حق کی گواہی چھپانے والوں اور حق کی خوشبودار سفیدی کے ساتھ باطل کی بدبودار سیاہی کو شامل کر دینے والے بزدلوں اور روباہ مزاج حیلہ گروں کو مردانہ وار للکارے گا اور پھر ہر چہ بادا باد کہکر تحریر وخطابت اور زبان وقلم کے کوہ شگاف اسلحہ سے مسلح ہو کر حق کی بیباک اور دوٹوک ترجمانی کے لئے آگے بڑھے گا یہاں تک کہ شہادتِ حق کے دینی فرض کے دیرینہ قرض کی پائی پائی کا حساب چکا دے گا بقول غالب

ایک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

شاہ جی مرحوم جیسے تیز ذہانت وقابلیت کے آدمی کے لئے سیاسی درباروں میں باریابی حاصل کرنا اور ان رستے سے دھن دولت کے انبار جمع کر لینا بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ وہ اگر دنیادار چرب زبان پیروں کی طرح خرقہ وسجادہ لے بہروپ کی مادی اہمیت کو زندگی کے کسی مرحلے پر بھی مان لیتے اور اس سے نفع اندوزی کے مخصوص شاطرانہ ڈھب کو تسلیم کر لیتے تو مرسڈیز اور پجارو جیسی چمکیلی گاڑیوں کی ریل پیل اور گھما گھمی ان کے آستانے پر بھی پوری ارادتمندی کے ساتھ آ کر اپنا سر جھکا دیتی۔

......لیکن آفرین اس سید پر کہ اس نے اپنے والد گرامی کی طرح ہر قسم کی زرق برق سراب آسا دنیا داری پر لعنت بھیج کر سچے سادگی پسند نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے کھرے حق کی لاج رکھ لی اور عمر بھر کے لئے گواہی حق کے عظیم اصول پر عمل پیرا رہ کر انہوں نے حفظِ صدق و حق کی سعی و جہد میں اپنے لئے حفظِ معاش کو بھی پس پشت ڈال دیا اور ان سچے صحابہ رضی اللہ عنھم کی سی قناعت و استغناء، فقر و فاقہ اور درویشی و قلندری کو ہمیشہ کے لئے سینے سے لگا لیا۔ جن کی عزت و ناموس کے لئے انہوں نے عمر بھر دشمن سے محاذ آرائی جاری رکھی۔ یوں ابوذر بخاریؒ ایک فطری مناسبت اور گہری عقیدت مندی کے زیر اثر ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے پیچھے چل پڑے اور ان کے نقوشِ پا کی ٹھنڈی حیات بخش روشنی کو اپنے دیدہ و دل میں سمو کر قلندری میں ہی سکندری کے مزے لوٹتے ہوئے ہمیشہ کے لئے شاد و بامراد ہو گئے۔ ''خدا رحمت کند ایں عاشقِ پاکیزہ طینت را''، اسی لئے میں کہتا ہوں کہ ان کے اس سرمایہ سیرت و کردار کی گرانبار اور بوجھل امانت کو اب اپنے کندھے پر کون لے گا؟ مرحوم کا ثانی کہاں سے آئیگا؟ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ اپنے علم یا عمل میں اپنے ہم عقیدہ اکابر و اسلاف حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ یا حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہم کے ہمسر و ہم پلہ تھے۔ اس بات کا دعویٰ تو نہ خود انہیں تھا اور نہ ہی میں یہ ہر حال میں ثابت کرنے کے لئے نکلا ہوں۔ لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ وہ اسی سلسلۂ منوّر کی ایک انتہائی روشن کڑی ضرور تھے اور ان کے معاصرین میں ان کے علمی مقام و مرتبے، ان کے استقلال کردار، ان کے ہمہ گیر مطالعہ، انکی تیز استدلالی ذہانت، ان کے قوی حافظے اور اس حافظے کی غیر معمولی انداز کی استحضاری صلاحیت، ان کی صاف صاف حق گوئی و بیباکی، ان کی غیر معمولی خطابت و شعلہ بیانی اور ان کے اردو فارسی اور عربی کے اعلیٰ جوہرِ شاعری وغیرہ کے بیک وقت مجموعے کی صورت میں مجھے ایک شخص بھی دور دور تک کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ دین حق کے عاشق بالکل ناپید نہیں۔ یہ یقیناً آج بھی موجود ہیں اور آئندہ بھی موجود رہینگے۔ لیکن ان عشاق میں مجنوں ہمیشہ ہر مقام پر کہیں نہیں ہو گا کہ مجنوں ہر روز پیدا نہیں ہوتے۔

شبے مجنوں بہ لیلیٰ گفت کاے محبوب بے ہمتا
ترا عاشق شود پیدا ولے مجنوں نخواھد شد

ترجمہ۔ ایک رات مجنوں نے لیلیٰ سے کہا کہ اے میرے بے مثال محبوب تیرے عاشق تو یقیناً آئندہ بھی پیدا ہوں گے لیکن ان میں مجنوں کوئی نہ ہو گا۔ (کہ جس طرح تو اپنے حسن میں بے مثال ہے یونہی میں اپنے عشق میں بے مثال ہوں) وہ لوگ جنہیں سید ابوذر مرحوم کی زندگی کا دیانتدارانہ اور غیر جانبدارانہ تحقیقی شعور حاصل ہے وہ جانتے ہیں کہ قدرت نے انہیں غیر معمولی قسم کی داعیانہ اور مبلغانہ استعداد سے نوازا تھا اور اس محاذ پر ان کی کارکردگی بعض امتیازی پہلوؤں کی حامل تھی۔ کتاب حق کے فہم و تدبر نے ان پر واضح کر دیا تھا کہ

اس کرۂ ارضی پر ہمارا واحد مقصد وجود شہادت حق ہے۔ ہم نے امت وسط و معتدل کو لتکو نوا شهد اعلی الناس یعنی بندگان خدا پر حق کی شہادت کے لئے تخلیق کیا (البقرہ ۱۴۳) سید ابوذر مرحوم کی جسور و غیورانا نے (مرحوم کے مزاج کو جانتے ہوئے لفظ انا پر زور دے رہا ہوں) زندگی بھر پوری جسارت و جوانمردی اور پورے جنونِ وفا کے ساتھ باطل کے عین مقابل آ کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے حق کی گواہی دی۔ انہوں نے شہادت حق کے چراغ کو طوفانِ باطل کی زد میں رکھ کر روشن کیا اور پھر باد تند و تیز کی گزرگاہ میں اپنے مضبوط جسم کو سدِ فاصل بنا کر عمر بھر کے لئے کھڑا کر دیا کہ اس کی اوٹ میں رہ کر چراغ کی قیمتی لو زندہ رہے میں ٹوٹ کر گرتا ہوں تو بے شک گر جاؤں یہ تھا ایک مرد درویش کا حق کی حفاظت کے لئے اظہار طاقت یا اظہارِ نازِ خسروانہ۔

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے

وہ مرد درویش جس کو حق نے دیے ہیں اندازِ خسروانہ

چراغ حق کو باطل کی ہواؤں کی زد میں لا کر روشن رکھنے کا عمل دراصل ان کے ہاں باطل کے خلاف مزاحمت پسندی کا عمل تھا۔ اس کا تاریخی پس منظر یہ ہے کہ فرنگی استعمار و استبداد کے ساتھ مسلسل تصادموں اور رات دن کی مسلسل جانکاہ تعزیروں نے مجاہدین احرار میں اور قائد احرار امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ میں جس طاقتور مزاحمت و مقابلہ کی باغیانہ روح کو مشتعل کیا تھا وہی روح وراثتاً اور فطرتاً سید ابوذر بخاری مرحوم کے جسم میں منتقل ہو کر نئی حرارت کے ساتھ متحرک رہی در حقیقت احرار اسلام کا مزاج ہی یہ تھا کہ انہیں برطانوی حکمرانی سے جتنی سزائیں ملتی تھیں اتنی ہی مقابلہ اور حصول غلبہ کی خواہش ان کے اندر زور پکڑتی تھی۔ ۱۹۳۹ء میں راولپنڈی کی ایک باغیانہ تقریر پر شاہ جی رحمہ اللہ پر شاہ برطانیہ کے خلاف بغاوت کا مقدمہ چلا جس کی سزا پھانسی تھی یا عمر قید۔ اللہ تعالیٰ نے شاہ جی کو بچا لیا اور عدالتی فیصلے کے مطابق انہیں بری کر دیا گیا۔ بقول ان کے وکیل ''کے ایل گابا'' کے شاہ جی نے شام کو ہی راولپنڈی سٹی گارڈنز میں جہاں وہ تقریر کرنے پر پہلے گرفتار ہوئے تھے۔ دوبارہ حکومت اور قادیانیوں کے خلاف ۴ گھنٹے تک یوں زور خطابت دکھایا کہ پچھلے بقائے کا سارا حساب چکا دیا اور رہی سہی کسر بھی نکال دی۔ '' یہ تھا ہر سزا پر جذبۂ حریت کا نئے سرے سے بار بار بیدار ہونا۔ حالی نے اس نفسیاتی افتادِ طبع کی تشریح شعری زبان میں یوں کی ہے کہ

تعزیر جرم عشق ہے بے صرفہ محتسب

بڑھتا ہے اور ذوقِ گناہ یاں سزا کے بعد

احراری ہونے کے ناطے قدرت کی طرف سے یہی مزاج سید ابوذر مرحوم کو بھی عطا ہوا تھا اور میرا خیال یہ ہے کہ امیر شریعت کے قبیلے کا ہر فرد اسی خصوصیت کا حامل ہے۔

باطل اور بدی کے خلاف شاہ جی ابوذر مرحوم کا کھلی دشمنی پسندی کا یہ رویہ ایک اور دینی جواز بھی رکھتا ہے۔ وہ یہ کہ اہل فکر و نظر کے ہاں باطل کی بربادی ہی ہمیشہ حق کی آبادی کے لئے گام اوّلیں شمار ہوتی رہی

ہے حق کا قیام باطل کے ٹھیک ٹھیک انہدام کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ کلمہ طیبہ میں "لا" کی تخریب باطل ہی کو "الا" کی تعمیر حق کے لئے پہلی اور ابتدائی ضرورت قرار دیا گیا ہے۔ ابوذر بخاری مرحوم شہادت حق کے ذریعے جس اجتماعی نظام حق کا احیاء چاہتے تھے اور جس کا اصلاحی نام ان کے ہاں بجا طور پر حکومت الہیہ تھا۔ اسے نظام ہائے باطل کی بنیادوں کو ڈھائے بغیر قائم کرنا ممکن ہی نہ تھا۔ چنانچہ اس سلسلے میں ان کے ذہن کی مثالیت پسندی خارجی معاشرے میں ایک ٹھوس حقیقت و واقعیت بن کر ابھرنے کے لئے اپنے اندر جو عزم شکست و ریخت رکھتی تھی وہ "الرحیق المختوم" کے جید سیرت نگار کے طرز فکر سے جو دراصل قرآنی طرز فکر سے پوری طرح مشابہ تھی۔ مذکورہ الصدر عظیم سیرت نگار دوسری وحی کے تبلیغی اور دعوتی مضمرات پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ

"رب کی بڑائی اور کبریائی کو بجا لانے کی آخری منزل یہ ہے کہ روئے زمین پر کسی اور کی کبریائی برقرار رہنے دی جائے۔ بلکہ اس کی شوکت توڑ دی جائے اور اسے الٹ کر رکھ دیا جائے یہاں تک کہ روئے زمین پر صرف اللہ کی بڑائی باقی رہے (الرحیق المختوم ص ۱۲۶ از مولانا صفی الرحمن مبارکپوری)

علامہ اقبال کے ہاں، "شعلہ بن کر پھونک دے خاشاک غیر اللہ کو" والی بات بھی اسی مفہوم و مقصود کی تائید میں جاتی ہے۔

اس اقتباس میں شوکت باطل کو توڑنے اور اسے الٹ کر رکھ دینے والے جس پرجوش اور فعال قسم کے انقلابی عمل کی دعوت نظر آتی ہے وہ چونکہ ان کے مزاحمت و مقاومت اور باطل پر ان کے حصول غلبہ کے طبعی میلان سے مناسبت رکھتا تھا اس لئے وہ نہ صرف عمر بھر اس کے دل و جان سے معتقد اور حامی رہے بلکہ اس کے ایک مستقل مزاج مبلغ اور داعی بھی رہے اور اس طرح اپنی زبان اور قلم کے طاقتور، تہلکہ خیز ہتھیاروں سے باطل کو مسمار بھی کرتے رہے۔ ان کے آغاز شباب سے لیکر ۱۹۹۵ء میں اُن کے سانحہ انتقال تک نصف صدی پر محیط یہ کذب و باطل دراصل بیسوی صدی کے دور جدید کا ایسا بت خانہ آذری تھا جس میں رافضیت، مرزائیت، پرویزیت اور بہائیت وغیرہ کے علاوہ عالمی سطح سے نازل ہونے والے لادینی ذہنوں کے تخلیق کردہ ملحدانہ سیاسی اور معاشی نظاموں مثلاً جمہوریت، فسطائیت، اشتراکیت، آمریت اور سرمایہ داری وغیرہ کے بڑے بڑے بت رکھے ہوئے تھے جن کی پشت پر سائنس کی نیوکلئیر قوتیں تھیں ان اصنام کو سید ابوذر بخاری مرحوم "لا الہ" کی ضرب حق سے مسلسل پاش پاش کرتے رہے۔ انہوں نے اس کفر و الحاد کو اپنے بے پناہ علمی استدلال کی تنقیدی اور تردیدی قوت سے توڑا۔ انہوں نے صرف ایوان ختم نبوت کو نقب لگانے والوں، تلبیس حق و باطل کے ذریعے اسلامی تاریخ کو مسخ کرنے والوں اور اخفائے حق کے ذریعے نامور صحابہ رضی اللہ عنہم کے نام اور کام کو گہنانے کی سازش کرنے والے ناکام اور نابالغ مؤرخوں کا ہی ساری عمر تعاقب نہیں کیا بلکہ بیسوی صدی کی حاضر پرست حِسّی تہذیب کے تاباں و درخشاں سومنات کو بھی ہمیشہ اپنے [illegible] پر رکھا۔ ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ جمہوریت یا اسی قسم کے دوسرے فاسد نظاموں کو اسلام کے اجتماعی [illegible] اپنانا شرک ہے۔ حق کی دن رات کی داعیانہ اور مبلغانہ گواہی کے اس عظیم کام

میں انہوں نے اپنی منبر و محراب کی خطابت، اپنی صحافت، اپنی شاعری اپنی ادبیت اور اپنی تصنیف و تالیف کی اعلیٰ صلاحیتوں کے سارے رأس المال کو پوری طرح کھپا دیا۔ یہاں تک کہ اپنی صحت، اپنے وقت اپنے جان و مال کا سارا اثاثہ بے بہا بھی اسی راہ میں لٹا دیا۔ بیسویں صدی کے ان پچاس سالوں کے قدیم و جدید کفر و ارتداد کے خلاف ان کا عالمانہ استدلالی ردّ عمل ان کی ان پچاس کتابوں میں دیکھا جا سکتا ہے جو انکے تیس سالہ پُر مشقت مطالعہ کا حاصل ہیں۔ حق یہ ہے کہ انہوں نے بیسویں صدی کے ظلمت زار کفر و باطل میں اشھد ان لا الہ الا اللہ کی بار بار اذان شہادت دے کر شہادت حق کے جو چراغ روشن کئے وہ انہی کا کام تھا۔ وہ بلاشبہ گواہی حق کی عظیم تاریخ کے ایک اہم ہیرو تھے۔ ایک بطلِ جلیل تھے جن کے علمی تبلیغی اور اصلاحی آثار مدتوں تک ماحول کو روشنی بخشتے رہیں گے۔

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں

مصلحت را تہمتے برآ ہوئے چیں بستہ اند

(ترجمہ) خوشبو بکھیرنا تو صرف تیری ہی زلف کا کام تھا۔ آہوئے چین و تاتار پر تو عاشقوں نے محض مصلحتاً تہمت باندھ رکھی ہے۔

سید ابوذر مرحوم کے عالمانہ اور داعیانہ کارناموں کا تجزیہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ بلاشبہ انہوں نے تمام رائج الوقت سیاسی اور مذہبی مسلکوں کے سیاہ جھوٹ کو بے نقاب کیا لیکن کارل مارکس کی اشتراکیت ایک ایسی زوردار معاصر تحریک تھی جو صریحاً انکار خدا پر مبنی ہونے کی وجہ سے بطور خاص ان کی مناظرانہ اور نقادانہ توجہ کا ہدف بنتی رہی۔ یہ لادینی معاشی تحریک صرف نظریاتی سطح پر خدا کی منکر نہ تھی بلکہ انکار خدا کی باقاعدہ عالمی سطح کی مبلغ و داعی بھی تھی۔ اس کا تاریخ کی مادی تعبیر کا نظریہ اول تا آخر دہریت کا ترجمان تھا۔ سید صاحب نے اس نظریہ باطل کا گہرا مطالعہ کیا اور اس کی طاقت فاسدہ کو بے اثر بنانے کے لئے پے در پے کئی اقدامات کئے۔ انہوں نے اشتراکی معاشیات کے مقابلے میں اسلامی معاشیات کے تصور کو عام کیا۔ مزدوروں اور کسانوں کے معاشی اور مالی حقوق کی حفاظت کے لئے نہ صرف اسلامی یونین سازی کی بلکہ کئی صحافتی پرچے مثلاً روزہ مزدور، وغیرہ نکالے جن کے ذریعے کسانوں اور محنت کش طبقے کی گونگی خواہشوں اور امنگوں کو اپنے اظہار کے لئے زبان میسر آئی۔ علمی مقالوں سے اسلامی معیشت کی برکتیں سمجھائی گئیں اور اسی طرح غریب عوام کو سرمایہ دارانہ اور اشتراکی دونوں قسم کے استحصال سے بچا کر انہیں اسلام کی پناہ گاہ رحمت میں محفوظ کرنے کی کوشش کی گئی۔ انہوں نے اشتراکیت کا ادبی میدان میں بھی مردانہ وار سامنا کیا۔ ادب کے اشتراکی نقطۂ نظر کے مقابلے میں جس کی ترویج ملکی سطح پر بطور ایک تحریک ۱۹۳۸ء کے شروع میں ہوئی تھی انہوں نے ادب کے اسلامی نقطۂ نظر کو متعارف کرایا۔ اور ۱۹۵۰ء میں "نادیۃ الادب الاسلامی" کے نام سے اسلامی ادب کی انجمن قائم کی۔ اور اشتراکی نظموں کے مقابلے میں نظمیں لکھیں اشتراکی شاعر نے سرخ سویرے کی منزل کو قریب لانے کے لئے جب یہ کہا کہ

اگر گھنا ہو اندھیرا اگر ہو دور سویرا

تو اک اصول ہے میرا کہ دل کے دیپ جلاؤ

تو سید ابوذر مرحوم نے اسی بحر، اسی قافیے کے ساتھ جواباً ایک نظم لکھی جس کا ایک شعر جوان کے اسلامی طرز فکر کی نمائندگی کرتا ہے حسب ذیل ہے۔

جو قصد منزل حق ہے تو پھر کتاب مُبیں کو

ہجوم تیرہ شبی میں چراغ راہ بناؤ

اسلام اور اشتراکیت کے معاشی نظاموں کی خوبیوں اور خامیوں کا فہم و شعور نہایت گہرے تنقیدی اور تقابلی مطالعہ کا متقاضی تھا۔ سید صاحب نے یہ کام کیا اور پوری دیدہ ریزی سے کیا ان کا علم اپنی وسعت اور گہرائی میں انسائیکلوپیڈیائی تھا اور انکی طلب علم بلا نوش اور ہمہ خورا (OMNIVOROUS) قسم کی تھی۔ دینی اور دنیوی دونوں قسم کی کتابوں کی کتابیں ہڑپ کر جانا ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ اس سلسلے میں ملک کے مشہور عالم اور مصنف حافظ عبدالرشید ارشد مدیر ماہنامہ "الرشید" کے تاثرات ملاحظہ فرمایئے۔

"حضرت مولانا سید عطاء المنعم بخاری المعروف سید ابومعاویہ ابوذر بخاری رحمۃ اللہ علیہ ملک کے ان معدودے چند افراد میں سے تھے جن کے علم کی گہرائی و گیرائی اتنی تھی کہ جس پر بجا طور پر کوئی قوم یا ملت ناز کر سکتی ہے۔ دین و دانش، فلسفہ و منطق، عروض و قوافی، نحو و صرف، عربی فارسی اور علم و ادب پر اتنا گہرا عبور تھا کہ جوان سے مل کر کسی بھی مسئلے پر اگر کوئی کچھ دریافت کرتا تو اس کے سامنے ایک دبستان کھل جاتا۔ کسی بھی عنوان و موضوع پر ان کا دماغ بند نہ تھا" (ماہنامہ الرشید نومبر ۱۹۹۵، ص ۵۱)

سید ابوذر مرحوم کی کثرت مطالعہ کی اٹل عادت کے بارے میں ایک معتبر روایت ہمیں یہ بتاتی ہے کہ ایک رات امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ دیر سے گھر پہنچے تو انہوں نے سید ابوذر مرحوم کو جب دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر محو مطالعہ پایا تو فرمایا، "حافظ جی! اب کتاب کی جان چھوڑ دو رات کے اڑھائی بج چکے ہیں۔" یہی روایت ہم پر اس بات کا انکشاف بھی کرتی ہے کہ ان کا مطالعہ کا یہ معمول بھی مدتوں تک رہا کہ وہ گرمیوں کی راتوں میں مکان کی چھت پر چاند کی روشنی میں کتاب کو آنکھوں کے قریب کر کے مسلسل پڑھتے اور انہیں ضعف بصارت کا بھی خیال نہ رہتا۔ سید صاحب نے (ان کے اپنے اعتراف کے مطابق) تیس سال تک نہایت بے جگری سے مطالعہ کیا اور بعض اوقات مطالعہ کے دوران ذہنی یکسوئی اور ارتکاز توجہ کی خاطر ایک کمرے کے گوشۂ عافیت میں محفوظ ہو کر دروازے کی کنڈی چڑھا کر طعام و آرام اور جسم پر لباس کی بے ترتیبی سے بے نیاز ہو کر (جس پر ان کی والدہ محترمہ گواہ تھیں کہ وہ طعام کے لیئے انہیں پکارتیں دروازے پر بار بار دستک دیتیں اور دروازہ پھر بھی نہ کھلتا) انہوں نے پوری تحقیقی لگن اور تنقیدی بصیرت کے ساتھ فقہ، ادب، علم الانساب، تاریخ اور خصوصاً اسلامی تاریخ اور دوسرے مروجہ علوم کی ساری بڑی بڑی کتابوں کو کھنگالا اور خصوصاً متنازعہ فیہ مسائل و مباحث پر دن رات متصادم رہنے والے دینی، نیم دینی اور لادینی مسلکوں اور

موقفوں کے عہد بہ عہد تاریخی اور تدریجی ارتقاء اور ان کے جھوٹ سچ کو کمال دقت نظر سے پڑھا، سوچا اور سمجھا۔ کتابوں کے حوالے پوری پوری عرق ریزی سے نوٹ کئے۔ تصدیق حق اور تردید باطل کے لئے عبارتوں کی عبارتیں زبانی یاد کیں اور صفحوں کے نمبر ازبر کئے جو جوش خطابت کے دوران ایک سیل رواں بن کر ان کے حافظے اور ان کی زبان فصیح البیان سے جاری ہوتے تھے اور پھر اس جان لیوا پر مشقت مطالعہ کے بعد وہ اپنے دارالمطالعہ کی خلوت گاہوں سے حق و باطل کے جن دو مثبت اور منفی اصولوں کو لے کر باہر نکلے ان کے درمیان انہوں نے حد فارق کھینچ دی اور پھر اس فاصل لکیر پر اسے نمایاں رکھنے کے لئے ساری عمر اپنی شہ رگ کا خون ٹپکاتے رہے کہ آئندہ کوئی با آسانی تلبیس حق و باطل کا مرتکب نہ ہو سکے۔ اسے مزید یقینی بنانے کے لئے انہوں نے ایک گرانقدر ورثے کے طور پر اپنے علمی خطبات و مقالات پر مشتمل کم و بیش ۵۰ مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں کا وقیع علمی مواد اپنے پیچھے چھوڑا جو ایک مینارۂ نور بن کر مستقبل کی نسلوں کے سرگرم سفر کاروانوں کو ان کی گم شدہ منزلوں کا سراغ دیتا رہے گا۔

جن لوگوں کو سید ابوذر مرحوم کے ساتھ گاہے گاہے نجی ملاقاتوں اور رابطوں کا شرف نصیب ہوتا رہا ہے وہ جانتے ہیں کہ مرحوم ایک سچے مرد حُر تھے جن کے روحانی وجود میں حریت کی روح جارہ عمر بھر مرتعش رہی۔ اس حریت پسندی کی تہ میں بھی دراصل وہی باطل کی راہ میں دیوار مزاحمت اور دشمن پر غلبہ پانے کا فطری میلان کارفرما تھا جس کا اوپر حوالہ آیا ہے۔ انہوں نے اپنے عہد میں اپنی خطابت کے بل پر جوانان احرار میں خون کی بھڑکتی جوالا کو بجھنے سے بچایا۔ اقبال نے اپنے شعری مجموعوں میں مرد حر کی ترکیب کو مرد مومن کے مترادف و متبادل کے طور پر برتا ہے۔ اس لئے باور کیا جانا چاہیئے کہ برصغیر پاک و ہند میں ۱۹۲۹ء میں وجود پذیر ہونے والی مجلس احرار کے رفقائے سفر یقیناً اعلیٰ درجہ کے مرد مومن تھے کیونکہ اس کا سنگ تاسیس جمانے والے سبھی اونچے درجے کے علماء کرام تھے۔ مثلاً امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم کے علاوہ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا سید محمد داؤد غزنوی، مولانا ظفر علی خان، مولانا عبدالقادر قصوری، مفکر احرار چودھری افضل حق و غیرہم، تحریک احرار کے یہ وہ زعما تھے جو سختی سے اسلامی نصب العین پر یقین رکھتے تھے۔ جس کے تحت انہوں نے خصوصیت کے ساتھ جن موضوعات پر مسلسل طور پر بے خوف قسم کی شہادت حق دی۔ وہ رد مرزائیت، تحفظ ختم نبوت اور مدح صحابہ تھے۔ تاہم بنیادی مطمح نظر یہ بھی تھا کہ فرنگی استعمار کو توڑا جائے اور برصغیر پاک و ہند کی محکوم انسانی نسلوں کو انگریزی طوق و سلاسل سے رہا کرایا جائے۔ یہی چیز آئندہ چل کر ملکی آزادی کی تحریک کے لئے بھی معاون و مددگار بنی۔ اسی اسلامی نصب العین کی روشن منزل کی جانب گامزن ہونے والے کاروان بلاخیز و بلاکش کا پورا تاریخی نام مجلس احرار اسلام تھا۔ جس کے سالار امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ تھے جو دراصل اس کی حقیقی اور اصلی روح رواں تھے۔ مجلس احرار اسلام کے کارکنوں کے بے لوث جانبازانہ کردار کے بارے میں مذکورۃ الصدر محقق مصنف اور عالم دین حافظ عبدالرشید ارشد کے تاثرات و خیالات ملاحظہ فرمایئے۔

"برصغیر کی سیاسی جماعتوں میں مجلس احرار اسلام ایسے سرفروشوں کی جماعت تھی جو ہر وقت جان

ہتھیلی پر، کفن کندھے پر لئے پھرتے تھے۔

احرار کے نام کا پوری جماعت پر یہ اثر تھا کہ حریت و جرأت چھوٹے سے چھوٹے رضاکار کی گھٹی میں پڑی تھی اور خوف نام کی چیز ان کی جمرٹی میں نہ تھی اور نہ ہے۔" (ماہنامہ الرشید نومبر ۱۹۹۵ء ص ۱۴)

مدیرِ محترم کے "نہ ہے" کے الفاظ تحریک احرار کے زندہ و موجود تحرک کی طرف بجا طور پر اشارہ کرتے ہیں۔ میرے خیال میں روحِ احرار واقعی زمان و مکان اور تاریخی عمل سے بے نیاز اور بالاتر شے کا نام تھا اور ہے۔ وہ کل بھی زندہ و موجود تھی آج بھی زندہ و موجود ہے اور آئندہ بھی ان شاء اللہ زندہ و موجود رہے گی۔ حریت پسندی اپنی دینی اساس میں مخلوق کو مخلوق کی بندگی سے حرّیت دلا کر خالق کی بندگی میں دینے کا نام ہے۔ ہماری عظمتوں کی تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ شہنشاہ ایران نے اسلام کے قرونِ اولیٰ کے مجاہدین کی شام و سحر کی پے در پے یلغاروں سے تنگ آکر اسلامی لشکر کے سپہ سالار سے دریافت کیا کہ آخر یہ تمہاری ساری یورشیں ہمارے خلاف کس مقصد کے لئے ہیں؟ شہنشاہ کا مدعا یہ تھا کہ انکی خواہش معلوم ہو جائے تو اسے پورا کر کے اپنی جان چھڑائی جائے۔ لشکر اسلامی کے سالار نے جواب دیا

لاخراج الناس من عباده العباد الیٰ عباده الله وحده.

یعنی ہماری یلغاروں کا واحد مقصد یہ ہے کہ انسانوں کو انسانوں کی بندگی سے آزادی دلا کر، انہیں اللہ کی بندگی میں دے دیا جائے......احرار اسلام نے بھی صحابہؓ کرام رضی اللہ عنھم کے اس اعلیٰ نصب العین کی پیروی کی۔ یہ تھا تحریک کا دینی مفہوم۔ اس کا سیاسی مفہوم تو گردو پیش کی سیاسی زندگی کی تطہیر کے لئے طے پا گیا تھا وہ اس کا زمانی اور زمینی پہلو تھا جو ناگزیر تھا۔ مجلس احرار اسلام کے اس قیمتی کردار کے وارث اور میری رائے میں اہل ترین وارث اور قائد (چند روز پہلے تک) سید ابو معاویہ ابوذر عطاء المنعم بخاری نور اللہ مرقدہ تھے جو اپنے ہمسفر احرار سے ہمیشہ کیلئے جدا ہو کر آج اپنے آخری کنج عافیت میں آسودہ اور سکون پذیر ہو چکے ہیں۔ اللھم اغفرلہ ورحمہ وادخلہ الجنۃ

اب میں بعض ذہنوں میں پیدا ہونے والے ایک سوال کا جواب دینا چاہتا ہوں اور سوال مختصراً یہ ہے کہ اتنی صلاحیتوں کے باوجود سید ابوذر مرحوم اپنے والد گرامی کی طرح مؤثر کیوں نہ ہو سکے؟......یہ بجا ہے کہ سید ابوذر مرحوم کے اندر اسلام کی گواہی کا جو فطری جوہر ناب تھا اسے بڑے شاہ جی کی طرح کسی بلند تر اور کشادہ تر افق سے ضیاء بار ہونے کا موقعہ نہ مل سکا اور یہ شاید ممکن بھی نہیں تھا۔ جس کی کئی وجوہات تھیں اس کے باوجود قدرت کی طرف سے انہیں ایک عظیم داعیٔ اسلام کی جو استثنائی اور غیر معمولی استعداد عطاء ہوئی تھی اس کے بل پر ان کی تبلیغ حق کی روشن شعاعیں چار سو پھیل کر تاریکی میں بھٹکتے انسانوں کی ایک دنیا کو بینا کر گئیں۔ ان کے جنازے کے شرکاء کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے جم غفیر میں جو کراچی سے لیکر پشاور تک کے لوگوں پر مشتمل تھا اور جس میں شامل ہونے والوں کی غالب ترین اکثریت مذہبی لوگوں کی تھی ان میں زیادہ تر ان کے روحانی متوسلین اور متاثرین ہی تھے۔ یہ چیز مرحوم کے شخصی اور دینی اثر و نفوذ کی عظیم وسعت کا ایک منہ بولتا ثبوت تھی جو یقیناً ان کے مؤثر ہونے کی دلیل ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ بڑے شاہ جی کو

اپنے خطیبانہ جوہر دکھانے کے لئے قبل آزادی کا جو سیاسی ماحول ملا وہ ان کی تربیت کا ایک اہم ذریعہ بنا۔ شاہ جی کو انگریز کے کافرانہ سیاسی تسلط کی صورت میں جو فعال قوت میسر آئی تھی وہ ان کے باغیانہ عزم و عمل کو آبیار کرنے اور نشوونما دینے کا باعث بنی۔ "پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے" کے مصداق خود کفر ان کے لئے ایک ایسا منبع اور ماخذ بن گیا جو ان کی جدوجہد کو توانائی اور حرارت بخشتا رہا۔ یہ سیاسی نوعیت کا نمو بخش ماحول سید ابوذر بخاری مرحوم کو میسر نہ آسکا کہ ملک آزاد ہو گیا اور دشمن قوت جو پلٹنے جھپٹنے اور لہو گرم رکھنے کا ایک اہم وسیلہ تھی برصغیر کو چھوڑ گئی ایک اور قابل لحاظ بات یہ ہے کہ بڑے شاہ جی محسود العلماء ہونے کے باوجود علماء کو اپنے ساتھ متحد رکھنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ جس کی ایک وجہ تو خود نصب العین کا صدق تھا۔ لیکن اس سے بھی اہم تر وجہ یہ تھی کہ دیوبند کی ایک جلیل القدر اور بے مثال ہستی حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے شاہ جی کو بھرے مجمع میں امیر شریعت نامزد فرما کر ان کے ہاتھ پر بیعت کی اور ان کی تقلید میں مجمع کے ہزاروں علماء نے بھی یہی طرز عمل اپنایا۔ اتحاد و اتفاق کی یہ فضا سید ابوذر کو میسر نہ آسکی جو ممکن بھی نہیں تھی۔ اس لئے سید ابوذر مرحوم کی فطری صلاحیت کا مہر نیمروز سمت الراس پر آکر اپنی تابانیوں کو اس طرح عام نہ کرسکا جیسے امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کو قدرت نے موقعہ عطاء فرمایا تھا۔ پھر ایک سیدھا سا فرق جو بڑا نمایاں فرق تھا، یہ تھا کہ دونوں کے ہاں وہبی استعداد اور جو ظاہر ہے وہاب ازلی کی عطاء کردہ تھی الگ الگ تھی اور اپنی اپنی تھی اور دونوں کو تربیتی ماحول بھی الگ الگ ملا تھا۔ ان حالات و عوامل میں دونوں کا ہم سطح ہو جانا یا مساوی ہو جانا کیسے ممکن تھا۔ پھر خلاق عظیم کا ذوق تخلیق بھی تنوع پسند واقع ہوا ہے۔ وہ یک رنگی اور تکرار کا کیسے متحمل ہو سکتا تھا۔

سید ابوذر بخاری مرحوم کا وجود گرامی، امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی حیات ازدواجی کے باغ شاداب کا ثمر اولین تھا۔ ان کی ولادت ۱۳ دسمبر ۱۹۲۶ء کو امرتسر میں ہوئی۔ ام الکتاب کی ابتدائی حرف شناسی کے بعد اسے ناظرہ پڑھنے کا مرحلہ والدہ محترمہ کی شفقت سے طے ہوا۔ حفظ کی منزل اس دور کے عظیم قاری حضرت مولانا قاری کریم بخش رحمۃ اللہ علیہ کی معلمانہ اور مربیانہ رہنمائی سے طے ہوئی۔ کم و بیش تیرہ چودہ سال کی عمر مدرسہ عربیہ خیر المدارس میں (جو ابھی جامعہ خیر المدارس کے نام سے موسوم نہیں ہوا تھا) داخل کرا دیئے گئے۔ یہ مدرسہ اس وقت جالندھر میں تھا۔ اس کا آغاز وہیں عمل میں آیا تھا اور اس کی خشت اساس ۱۹۳۱ء میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے بابرکت ہاتھوں نے جمائی تھی۔ مؤسس وہ تھے اور بعد میں اسکے ارتقاء کے ہر مرحلے میں اس کے مؤثر ترین معمار و مربی اور محافظ خیر الاساتذہ حضرت مولانا خیر محمد جالندھری رحمۃ اللہ علیہ بنے۔ جن سے موصوف کو باقاعدہ شرف تلمذ حاصل رہا۔ سید ابوذر بخاری مرحوم اپنی عمر کے کم و بیش بائیسویں سال میں تھے۔ کہ ۱۹۴۷ء کے انتقال آبادی کے ساتھ یہ مدرسہ بھی ملتان میں منتقل ہو گیا۔ اگلے سال ۱۹۴۸ء میں دورۂ حدیث کے مکمل ہو جانے پر سید ابوذر بخاری مرحوم کو سند فراغت عطاء کر دی گئی۔ اس عظیم دینی درسگاہ کی روح پرور علمی فضاء ہمارے سید کی روحانی بالیدگی کے لئے شاداب موسم ثابت ہوئی۔

سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا خیر المدارس ملتان کا زمانۂ طالب علمی جو ایک منتہی کا زمانۂ طالب علمی تھا اور ان کے شفاف سیرت و کردار کے بعض فضائل کو ہم پر اجاگر کرتا ہے۔ مثلاً جب وہ اپنے یومیہ سبق کے لئے اپنی مادر علمی جامعہ خیر المدارس جاتے تو قرآن پڑھتے ہوئے جاتے اور قرآن پڑھتے ہوئے واپس آتے یوں اپنی منزل پر پہنچتے پہنچتے قرآن پاک کی کئی منزلیں بھی طے کر جاتے۔ بازار سے گزرتے ہوئے قرآن کے ورد وظیفہ کا یہ معمول انہیں گردو پیش کی ہر ترغیب گناہ سے محفوظ رکھتا۔ تقویٰ کے اصول کو اپناتے ہوئے وہ قرآن کریم کو اپنے لئے حصار رحمت و حفاظت بنا لیتے۔ عام حالات میں بھی ان کے ہاں اسی حسن کردار کی تصدیق ہوئی ہے کہ وہ ہمیشہ نظریں سامنے جھکا کر چلتے تھے، دائیں بائیں دیکھنے میں دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ تاکہ فساد نظر، فساد قلب کا باعث نہ بنے۔ وہ اپنی مادر علمی کو بے حد تعظیم کی نظر سے دیکھتے تھے اور اپنے اساتذۂ گرامی کی موجودگی میں نہایت مؤدب اور محتاط ہو کر بیٹھتے تھے۔ ان کے اس رویے کی گواہی ان کی ایک بڑی تقریر سے بھی ہمیں ملی جو انہوں نے جامعہ خیر المدارس میں فرمائی تھی۔ تقریر کا مختصر اقتباس ملاحظہ فرمایئے، فرماتے ہیں:

"یہاں آکر (یعنی اپنے اساتذہ کے سامنے آکر) خطابت کے انداز میں گفتگو کرنے سے مجھے شرم دامنگیر ہوتی ہے۔ میرے لیئے اتنی سعادت ہی بہت ہے کہ میں اپنے استاد کی اولاد کا منہ دیکھ لوں۔ مدرسہ کو دیکھ لوں، یہ آباد نظر آئے، یہاں سے قال اللہ وقال الرسول کی جو صدائیں بلند ہوتی ہیں وہ میری زندگی میں بھی یونہی بلند ہوتی رہیں اور بعد میں بھی، اس سے زیادہ میری کوئی تمنا نہیں"۔

(ماہنامہ نقیب ختم نبوت نومبر ۱۹۹۵ء ص ۱۶)

ہمارے ممدوح شب خیز تھے اور اپنی عبادت میں ریاضت و مجاہدہ کے عادی تھے۔ آخری ایام میں ضعف پیری اور غلبۂ مرض کے باوجود تھکن کو زیادہ خاطر میں نہ لاتے تھے۔ ماہ صیام کی بابرکت راتوں کو قرآن پاک پڑھتے ہوئے مسلسل حالت قیام میں گزار دیتے۔ حتیٰ کہ سحر کی پہلی ساعت دستک دیتی۔ سحری صرف ایک گلاس لسی اور ایک ٹوسٹ سے مکمل ہو جاتی۔ زمانہ صیام میں وہ ایک رات میں اٹھارہ سپارے ختم کر دیتے۔ خشوع و خضوع، عجز و نیاز اور انکسار و شکستگی کی کیفیت غالب رہتی۔ خصوصاً دعا بائے نیم شبی کے خاص لمحوں میں رقت قلب طاری رہتی۔ داخلی کیف و کیفیت کا یہ انمول خزانہ ان کے اس تزکیۂ باطن اور تہذیب نفس کا نتیجہ تھا جو انہیں اپنے مرشد کامل حضرت شاہ عبد القادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت کیمیا اثر سے میسر آیا تھا۔ مرشد نے انہیں خلعت خلافت سے نوازا اور چار سلاسل تصوف میں بیعت کی اجازت دی۔ خلافت کا یہ اعزاز کسی کی سفارش یا تمنا پر عطاء نہیں ہوا تھا۔ یہ انہیں ان کے روحانی کمال کے مطلوبہ معیار تک پہنچ جانے پر حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ نے مستحق سمجھ کر عطاء فرمایا تھا۔ علاوہ ازیں ان کے والد گرامی کے بعد ان کے استاد گرامی اور بالخصوص مہتمم دار العلوم دیو بند حضرت قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ کی بابرکت علمی محبتیں اور تربیتیں بھی ان کے لئے جمال ہمنشیں ثابت ہوئیں اور ان کی شخصیت کو بھرپور زندہ قسم کی روحانی نمود و نمو سے ہمکنار کر گئیں۔ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ

اور سید ابوذر مرحوم میں ایک قدر مشترک جو دونوں کے درمیان گہری باطنی قربت کا باعث تھی یہ تھی کہ قرآن و حدیث کے علوم کی تفسیر و تشریح کے دوران علمی نکتہ آفرینی اور دقیقہ سنجی اور فکری استنباط اور استخراج کی صلاحیت دونوں میں ہی اختصاص کے ساتھ موجود تھی۔ دونوں میں ہی ایک طرح کی مفکرانہ غواصی کا جوہر تھا۔ جو مخاطب کو اپنی جانب متوجہ کر لیتا تھا۔ اسی طرح بین الاقوامی سطح کے عالم شہیر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی بھی سید صاحب کی علمی ذہانت سے متاثر و مطمئن ہوتے تھے اور اپنے ملاقاتیوں سے شاہ جی کا حال احوال بڑے التفات سے دریافت فرمایا کرتے تھے۔

۱۹۴۸ء میں جب سید ابوذر مرحوم نے خیر المدارس سے علمی فراغت کا اعزاز حاصل کیا اُن کا شباب صحت مندی اور شادابی کی فطری انتہا پر تھا۔ وہ دینی علوم اور دنیوی تجربہ دونوں سے مالامال اور مسلح تھے۔ اس لئے وضع قطع سے عالمانہ وقار و وجاہت کے ساتھ ساتھ ایک مرعوب کن جوانمردانہ سطوت بھی ٹپکتی تھی۔ شباب کی وجہ سے ان کے اندر عمل کی بے پناہ قوت بھی تھی اور طبعی شجاعت کی وجہ سے عمل کے لئے بے خوفی اور بے پرواہی بھی۔ مزاج میں ایک خودداری اور غیرت مند مومن کی برہمی تھی نیز اظہار برہمی عام طور پر ان لوگوں پر کرتے جو اپنی جہالت کو علم سمجھنے کے مریض تھے یا اپنے جھوٹ کو سچ سمجھنے اور پھر اسے دوسروں سے تسلیم کروانے پر مصر ہوتے تھے وہ حق کے بے لوث ترجمان و پاسبان تھے۔ اس لیئے حق کی بلا تحقیق اور بلادلیل تردید بھی انہیں برہم کر دیتی تھی۔ طبعیت کی یہ برہمی دشمنان دین کے خلاف انکے جوش خطابت کی طغیانیوں اور تلاطم خیزیوں کے دوران علانیہ ظاہر ہوتی تھی۔ یہ ان کے ایمان خالص کا ایک حصہ تھی اور بعض اوقات تنقید بن کر ملمع ساز علماء سُو پر بھی برس جاتی تھی۔ (لیکن اس برہمی کا مطلب یہ نہیں کہ ان میں شفقت اور نرمی نام کی چیز تھی ہی نہیں، عام حالات میں بہت شفیق و کریم بھی ہوتے تھے) اپنے کھرے صدق کو دوستوں پر یقیناً مصالح سے بالاتر ہو کر ہی ظاہر کرتے تھے اور اس لئے کرتے تھے کہ سچی شہادت حق کی طرح کی مصلحت اور مصالحت کی متحمل نہیں ہوا کرتی تدین اور تدبن کبھی یکجا نہیں ہو سکتے۔ حق کی راہ کی مبارزت کبھی مفاہمت کو قبول نہیں کرتی۔ شہادت حق کے سلسلے میں ان کی ابتدائے شباب کی ابتدائی تقریر جو سید احمد شہید بریلوی اور ان کی تحریک کے موضوع پر تھی اور جو عام خاص باغ کے ایک جلسہ میں کی گئی تھی بلا کی اثر انگیز اور مسحور کن تھی۔ غالباً حضرت امیر شریعت رحمتہ اللہ علیہ بھی اس جلسہ میں موجود تھے اور اپنے بیٹے کی داعیانہ اور خطیبانہ صلاحیت پر انگشت بدنداں تھے۔ برادرم حافظ عبدالرشید ارشد کا تاثر یہ تھا کہ تقریر علم کا ایک بحر ذخار تھی۔ اور خطابت کا ایک زبردست شاہکار۔ ساری تقریر آب زر سے لکھے جانے کے قابل تھی بقول ان کے یہ میری سنی ہوئی دو تین بڑی تقریروں میں سے ایک تھی اور یوں لگتا تھا جیسے آسمان کے فرشتے ان کی مدد کے لئے اتر چکے ہوں۔ یہ تقریر ان کے ابتدائی دنوں کی ایک اہم اٹھان کو ظاہر کرتی ہے۔

حضرت امیر شریعت رحمتہ اللہ علیہ کی عظیم الشان شخصیت کونسے محاسنِ ذاتی اپنے سعادت مند بیٹے کو منتقل نہ کر گئی۔ متناسب جسم و جثہ۔ بھرپور صحت مند چہرے کی سرخ و سفید رنگت، تراشیدہ خط و خال کے اندر جھلک دکھاتی ہوئی جوانمردانہ کشش ایک عالمانہ وقار و وجاہت اور جلالی و دبدبہ۔ آنکھوں میں چشم

عقاب کی سی تاب و تواں اور دم خم۔ یہ تھا مختصراً ان کا ظاہر۔ اب ذرا باطنی خصوصیات ملاحظہ کیجئے۔ اپنے سینے میں ایمان کا آتش کدہ تو انہوں نے میراث میں پایا ہی تھا کچھ اور بھی فضائل تھے جنہیں ان کی شخصیت کے لازمی اجزائے ترکیبی کہا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر اصلاً عرب سید ہونے کے ناطے ان کے اندر سید العرب صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ہم دیار جاں نثار صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے قومی فضائل و عادات مثلاً جذبۂ غیرت مندی، ایفائے عہد کا جنون، بہادری اور شجاعت، شاعری اور خطابت، فیاضی اور سخاوت، مہمان نوازی اور مسافر پروری، ضرورتمندوں کے لئے اپنے آپ کو لٹا دینے کا عزم و سودا...... عربوں کی ان تمام خصوصیات میں سے بہت سی خصوصیات واضح طور پر امیر شریعت کو ایک آبائی ورثے کے طور پر منتقل ہوئی تھیں۔ اور ان سے ان کے فرزند ارجمند کو متوارث و منتقل ہو گئی تھیں۔ یہ لوگ ولادتاً سرزمین پاک و ہند سے ہی منسوب تھے لیکن اساساً و اصلاً عرب سید تھے۔ یہاں تک کہ یہ بات ان کے غیر متزلزل عقیدے کا ایک لاینفک حصہ تھی کہ اسلام وہی برحق ہے جس کا ربط و رشتہ عرب کی سرزمین پر نشوونما اور ارتقا پانے والی تاریخ حق کے قرن اوّل سے ہے۔ صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہ رضی اللہ عنھم ہی معیار حق ہیں۔ جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء میں افضل و اشرف ہیں یونہی صحابہ رضی اللہ عنھم تمام انسانوں میں انبیاء کے بعد افضل و اشرف ہیں۔ اسلام خالص کے اسی مرکز و منبع کی طرف بازگشت کا عمل اور اسی مرکز و منبع کے ساتھ ملت اسلامیہ کی ابتدائی سچی وابستگی (COMMITMENT) کی پھر سے بحالی اسلامیان عالم کو مؤثر قسم کی یک جائی اور ایک نتیجہ خیز قسم کے اتحاد و اتفاق سے ہمکنار کر سکتی ہے...... یہ تھی سرزمین عرب سے ان کی لازوال دائمی نسبت جو ان کے لئے فخر و ناز کی سب سے قیمتی پونجی تھی اور جو ان کی زندگی کے لئے ایک موج نفس کا درجہ رکھتی تھی اور یہیں سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ کیوں انہوں نے اپنی بہار عمر کی ایک ایک ساعت ناموس ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے سرفروشانہ دفاع کے لئے نچھاور اور نثار کر دی اور اپنے عہد میں دو اسلام دشمن اور معاشرہ دشمن فتنوں کا مقابلہ کرنے کے لئے احرار اسلام کی جواں سال نسلوں کی تیاری اور آبیاری کا اہم کام سرانجام دیا۔

سید ابوذر مرحوم سے میری ملاقاتوں کا آغاز صدی رواں کے ساٹھ کے عشرے میں ہوا۔ غالباً ۱۹۶۴ء کی بات ہے، موسم گرما اپنے زوال پر تھا۔ میں کچہری روڈ پر واقع ریلیکس ہوٹل میں جو میری رہائش گاہ سے ...ب تھا اور جہاں میری نشست روزانہ ہوتی تھی بیٹھا ہوا تھا کہ یکایک سفید لباس میں ایک متشرع عالم دین اندر قدم زن ہوئے۔ ان کے صحت مند سرخ و سفید چہرے اور ریش مقدس سے ایک ملکوتی نور پھوٹتا محسوس ہوتا تھا۔ انہوں نے اونچی باڑ کی کپڑے کی ٹوپی، شلوار اور کرتہ زیب تن کر رکھا تھا۔ پوری شخصیت اپنے فطری جلال و جمال کی وجہ سے کچھ سحر آفرین اور مرعوب کن تھی۔ وہ میرے دیکھتے ہی دیکھتے ایک دو آدمیوں سے ذرا وقار و متانت کے ساتھ ملے تو مجھے ان کا برتاؤ اور رکھ رکھاؤ منفرد سا لگا۔ جس سے مجھے ان کے ہاں ایک خاص طرح کی خودداری ہی نہیں انفرادیت پسندی کا بھی احساس ہوا۔ جو بڑی شخصیات کا ہمیشہ خاصہ رہی۔ مثلاً ابو الکلام آزاد کی شخصیت، جس سے وہ خود بہت متاثر تھے اور پھر "کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست" کے

مصداق میری نظر ان پر مرتکز ہو کر رہ گئی۔ انسانی ذہن کا یہ تلازماتی عمل بھی ایک عام سی بات ہے کہ ہمیں مماثل چیزیں اکثر و بیشتر ایک ساتھ یاد آتی ہیں۔ مجھے اس شخصیت کے چہرۂ روشن سے امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کا چہرہ یاد آ گیا۔ اور دونوں چہروں میں ایک غیر مبہم مشابہت کا احساس ہوا اور میں یہ سمجھ گیا کہ یہ جواں سال عالم دین چشم و چراغ یقیناً اسی خاندان کا ہے۔ اس دوران میں وہ آگے بڑھے اور ہوٹل کے ایک الگ تھلگ گوشے میں جا کر بیٹھ گئے۔ میں بھی تھوڑی دیر بعد اٹھا اور کچھ مرعوب و محتاط رویئے کے ساتھ اجازت لیکر بالمقابل جا کر بیٹھ گیا۔ جانبین کی طرف سے تعارف ہوا جس کے دوران اندازہ ہوا کہ وہ مجھے میرے بڑے بھائی بابو تاج محمد کے حوالے سے جو اپنے دور میں عقیدۂ ختم نبوت کے ایک جی دار مبلغ اور مناظر رہے تھے جانتے تھے۔ خوب باتیں ہوئیں اور نماز مغرب سے تھوڑا سا پہلے ہم الگ ہو گئے۔ مرحوم سے ملاقاتیں چلتی رہیں کبھی ہوٹل پر (ہوٹل کی ان علمی ادبی گفتگوؤں کو میں ان شاء اللہ آئندہ کسی موقعہ پر احاطۂ تحریر میں لاؤنگا) کبھی ان کے دولت خانے پر اور کبھی مدرسہ معمورہ دار بنی ہاشم میں جہاں وہ خاص خاص مواقع (عیدین وغیرہ) پر خطاب فرمایا کرتے تھے۔ ان تمام ملاقاتوں میں دو باتیں کھل کر سامنے آئیں۔ اوّل یہ کہ ان کے پاس کہنے کو بے شمار علمی اور فکری باتیں ہوتی تھیں۔ کیونکہ بلاشبہ ان کی ذات بابرکات دین کی علمی معلومات کا ایک بے مثال مخزن تھی۔ دوم یہ کہ وہ اپنے مخاطب پر اپنی بات کو مسلط نہیں کرتے تھے وہ خواہ مخواہ کے ادعائی نہیں تھے۔ گفتگو تحمل سے فرماتے تھے۔ اور اپنے مخاطب کو پوری ہمدردی کے ساتھ سننے اور سمجھنے کا ظرف بھی رکھتے تھے اور اسے مطمئن کرنے کی بھرپور صلاحیت بھی۔ پھر یوں ہوا کہ لیل و نہار کی گردشوں کے ساتھ ساتھ کچھ بہ تقاضائے عمر بھی ان کی صحت مضمحل ہوتی گئی۔ فالج کے دو حملوں نے انہیں بے بس کر دیا۔ آخری ایام میں جب ابھی سلب گویائی کا حادثہ رونما نہیں ہوا تھا میں اور میرے ایک نہایت ہی عزیز پڑوسی خان احمد یار خان بارکزئی (اب وہ انتقال کر گئے ہیں) کبھی کبھی عیادت کے لئے ان کے در دولت پر حاضری دیتے رہتے تھے۔ وہ نہایت ہی شفقت و محبت سے پیش آتے۔ پورے التفات سے حال احوال پوچھتے۔ مجھے فرماتے آپ اپنی ادبی صلاحیت کو کام میں لائیں اور مسلسل لکھیں آپ لکھتے کم ہیں، لکھنے کی رفتار بڑھائیں۔

ان ملاقاتوں میں گفتگو کے دوران وہ بعض اوقات چھوٹی چھوٹی باتوں پر آبدیدہ ہو جاتے۔ گفتگو کے موقع و محل کے مطابق جب میں ان کے مذاق شعری کا پاس و لحاظ کرتے ہوئے کوئی اچھا شعر سناتا تو ان پر رقت طاری ہو جاتی اور آنکھیں بھیگ جاتیں۔ ایسی ہی ایک ملاقات میں جو ظاہر ہے مزاج پرسی کی غرض سے تھی انہوں نے غلبۂ ناتوانی کے باعث اوپر اٹھنے سے اپنے آپ کو معذور بتایا تو مجھے غبار خاطر کا مولانا آزاد کا ایک منتخب شعر یاد آ گیا جسے سن کر ان کی حالت غیر ہو گئی، شعر یہ تھا

طاقتِ برخاستن ازخاکِ نمناکم نماند
خلق می گوید کہ مے خورداست و مست افتادہ است

آخری ملاقات فاطمہ میڈیکل سنٹر (واقع رشید آباد چوک ملتان) میں ہوئی جہاں وہ داخل کروادیئے گئے تھے میں اور جناب خان احمد یار خان صاحب مذکورہ سنٹر پہنچے تو ان کے فرزند ارجمند معاویہ باہر ہی مل گئے۔ جو ہمیں ان کے کمرے میں لے گئے۔ نہ جا کر میں نے انہیں متوجہ کرنے کے لئے تعارفاً اپنا نام بتایا۔ انہوں نے پلکیں اوپر اٹھائیں۔ میں نے مصافحہ کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا، انہوں نے فرط شفقت و محبت سے میرا ہاتھ سینے سے لگا لیا اور ساتھ ہی بے ساختہ رونا شروع کر دیا۔ اس منظر نے ہمیں بہت متاثر کیا۔ ہم دونوں بھی وفور جذبات سے مغلوب ہو کر آبدیدہ ہو گئے۔ رقت قلبی کا اس انداز کا غلبہ میں نے ان کے ہاں پہلے نہیں دیکھا تھا۔ اس دوران عزیزم معاویہ نے بتایا کہ ہسپتال والوں نے گھر جانے کی اجازت دے دی ہے۔ چنانچہ فوراً ایمبولینس منگوائی گئی۔ سید صاحب کو اٹھا کر اس کے اندر لٹا دیا گیا۔ معاویہ ان کے ساتھ بیٹھ گئے۔ میں اور خان احمد یار خان کار میں سوار ہوئے اور انہیں ان کے دولتکدے پر چھوڑ کر کچھ دیر بغرض دلجوئی ان کے پاس بیٹھے اور پھر اجازت لے کر واپس آ گئے۔ مجھے خبر نہیں تھی کہ ان کا میرے ہاتھ کو سینے سے تادیر لگائے رکھنا اور پھوٹ پھوٹ کر رونا کیا مفہوم رکھتا ہے۔ کہاوت بتاتی ہے کہ آنے والے واقعات اپنی پرچھائیں پہلے ہی ڈال دیتے ہیں۔ اب کچھ سمجھ میں آتا ہے کہ انہیں شاید اس بات کا دھندلا سا احساس ہو گیا تھا کہ یہ آخری ملاقات ہے۔ جیتے جی اب کبھی ملاقات نہیں ہوگی اور واقعی ہو بھی نہ سکی۔ کچھ مدت بعد جب ان کا سیال کلینک میں آخری وقت آیا تو میں ان کی زیارت کی سعادت سے بہرہ یاب نہ ہو سکا۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ...... وقت آہستہ آہستہ گزرتا گیا اور پھر قضاء الہی سے سیال کلینک میں رات دس بج کر چالیس منٹ پر بروز پیر ان کی مہلت حیات اپنی حد اختتام کو پہنچ گئی۔ جن لوگوں نے انہیں اس آخری وقت میں دیکھا اور ان کی جنبش زبان کی مدہم آوازوں کو کان لگا کر سنا وہ گواہ ہیں کہ ان کی زبان مبارک پر اللہ اللہ کا ورد جاری تھا۔ ذکر اسم ذات کی یہی کیفیت ان کے والد گرامی امیر شریعت نور اللہ مرقدہ کے ہاں بھی آخری وقت میں دیکھنے والوں نے دیکھی تھی۔ ایک اور مماثلت اور یکسانیت جو ان دونوں ہستیوں کے اوقات آخریں میں ہمیں دکھائی دیتی ہے وہ یہ ہے کہ دونوں کا انتقال پیر کے دن کے اختتام پر صرف چار گھنٹوں کے فرق کے ساتھ عمل میں آیا اور دونوں کی تدفین منگل کے روز عصر کے بعد عمل میں لائی گئی۔ جنازے میں شرکاء کی حاضری ملک گیر تھی۔ مختصر وقت کی اطلاع کے باوجود کراچی سے لیکر پشاور تک کے مخلص غمگسار ادھر ادھر بکثرت دکھائی دے رہے تھے۔ نماز جنازہ مرحوم کی وصیت کے مطابق جامعہ خیر المدارس کے حضرت مولانا مفتی عبدالستار صاحب مدظلہم العالی نے پڑھائی اور پھر انہیں جلال باقری قبرستان میں ان کے والدین کی قبروں کے عین درمیان دفن کر دیا گیا اور یوں ایک نہایت ہی پاکیزہ اور عظیم زندگی کی داستان اپنے منطقی انجام کو پہنچ کر ختم ہو گئی۔ نماز مغرب کی اذانیں شروع ہو گئی تھیں نماز پڑھ کر ہم گھروں کو چلے تو رات معمول سے کہیں زیادہ تاریک لگ رہی تھی۔ خصوصاً معاویہ، مغیرہ کے ذہنوں میں تاریکی کا یہ احساس اور بھی شدید تھا کہ وہ شفقت پدری کے گنج گرانمایہ سے محروم ہو گئے تھے۔ ان کے خاموش